''بے پناہ شادمانی کی مملکت'': عصری شعور کا استعارہ

ڈاکٹر عبدالعزیز ملک[1]

Abstract

Arundhati Roy is famous Indian author and political activist. She got popularity by her first novel" The God of small things" which was published in 1997. In 1998 it won Man Booker Prize, a prestigious British award given annually to a full length novel. Her second novel "The ministry of Utmost Happiness" is published in 2017 which is the story of Anjum, a eunuch living in graveyard of Dehli. Through this character, she depicted the contemporary history of India. In this article humble effort is made to point out the important and historic events, mentioned in this specific novel.

کلیدی الفاظ: **ناول، اردو ناول، انگریزی ناول، ترجمہ، ہندوستان، کشمیر، عصری شعور، تنقید**

ناول نگار انسانی وجود کی ان دیکھی دنیاؤں کو دریافت کرنے، پھر انھیں تخلیقی عمل سے فن پارے میں ڈھالنے اور اس فن پارے کو احساس و جذبات کی بھٹی میں کندن بنانے سے، اس وقت تک قاصر رہتا ہے جب تک کہ وہ اس عمل میں تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی ماحول کو شامل نہ کر لے۔ سماجی حالات، سیاست، مذہب اور تاریخ وغیرہ ایسے عناصر ہیں جو ناول کی تخلیق میں اساسی عنصر کے طور پر موجود ہوتے ہیں، اس لیے شاذ ہی ایسا ہو کہ کوئی ناول نگار ہم عصر صورتِ حال کو منعکس نہ کرے۔ دنیا کا ہر بڑا ناول عصری اور سماجی شعور کو اپنی ہیئت میں یوں منقلب کرتا ہے کہ وہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماورا، مستقبل کے امکانات اور زندگی کے متنوع گوشوں کو منکشف کرتا چلا جاتا ہے، اسی لیے وہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور نفسیاتی رویوں کا علامتی اور استعاراتی انداز میں ترجمان بن کر سامنے آتا ہے۔ اردو ناول کی روایت میں ڈپٹی نذیر احمد کے ''ابن

1 لیکچرر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

الوقت'' سے لے کر دورِ حاضر کے، قرۃ العین حیدر کے ''آگ کے دریا''، عبداللہ حسین کے ''اداس نسلیں'' اور شمس الرحمان فاروقی کے ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' تک ہر بڑا ناول عصری اور سماجی شعور کا آئینہ دار ہے۔ عالمی ادب میں بھی ہر عظیم ناول تاریخی، سماجی اور عصری شعور کا حامل ہے جو ایک خاص سماج اور ثقافت کا نا صرف پر وردہ ہے بلکہ اس پر اثرات بھی مرتسم کرتا ہے۔ اس حوالے سے ایملی برونٹے کا'' وتھرنگ ہائٹ''، جارج آرویل کا''اینمل فارم''، جین آسٹن کا ''پرائیڈ اینڈ پریجوڈس'' دوستوفسکی کا ''ایڈیٹ''، میکسم گورکی کا''ماں'' اور گارشیا مارکیز کا''تنہائی کے سو سال'' وغیرہ مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں جو انسانی وجود کی پوشیدہ جہات کو سماجی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں تلاش کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ادب اور تاریخ کا ہم رشتہ ہونا ہے جس کی طرف ہیگل اور مارکس جیسے معتبر مفکرین نے بھی اپنی تحریروں میں اشارے کیے ہیں لیکن ادب اور تاریخ کا رشتہ اتنا سیدھا اور یک رخا بھی نہیں کہ اس میں ثقافت، سماج اور تاریخ واضح اور شفاف انداز میں تلاش کی جا سکے۔ اس میں معاشرے کے اجتماعی اور انفرادی ہیجانات واضطراب کی محض جھلک موجود ہوتی ہے جسے قاری اپنی ذہنی بصیرت سے آشکار کرتا ہے۔

ارون دھتی رائے کا ناول'' بے پناہ شادمانی کی مملکت'' ایسا ناول ہے جس میں عصری تاریخ، سماج اور ثقافت فکشن کے قالب میں ڈھل کر ناولی حقیقت کے طور پر ہمارے سامنے آئی ہے۔ مصنفہ نے بھارت کے مذہبی، سیاسی، معاشی، جغرافیائی، فکری اور صحافتی منظر نامے کو جس مہارت کے ساتھ ناول کے وسیع کینوس پر منتقل کیا ہے، اسے تادیر ایک تاریخی دستاویز کے طور پر پڑھا جاتا رہے گا۔ اندرا گاندھی کی ایمر جنسی، سکھوں کا قتل عام، بھوپال میں کار بائیڈ گیس کا واقعہ، بابری مسجد کا انہدام، گجرات فسادات، اناہزارے کی بھوک ہڑتال، امریکی ۹/۱۱ کا بھارتی رنگ، گجرات فسادات، عام آدمی پارٹی کی پیدائش، دہلی کی آلودگی، عراق امریکہ جنگ کے اثرات، دہشت گردی، مسلمانوں کا قتلِ عام، کشمیر کی صورتِ حال، بستر کے جنگلوں میں جاری علاحدگی پسند تحریک، مودی کے وزیر اعظم بننے کے انداز، بی جے پی کی ترجیحات، انٹیلی جنس سیکورٹی فورسز کی چالاکیاں، مجاہدین کی وارداتیں، مخبر، بھارتی ایجنسیوں کے ایجنٹ، بکاؤ صحافی اور اسٹیک ہولڈر سبھی اس ناول کے صفحات پر اپنی پوری آب وتاب سے موجود ہیں۔ ناول نگار نے سماج اور سماجی رویوں کی جراحی کا عمل اس خوب

صورتی سے کیا ہے کہ مصنفہ کا بھارتی سماج، ثقافت اور معاشرے سے نفرت کے بر عکس بے پناہ محبت کا جذبہ منعکس ہوتا نظر آتا ہے۔اس کے بیانیے میں معاشرتی بد عنوانیاں، مسلم مخالف فکر، پسے ہوئے طبقے کے احساسات وجذبات اور سماجی ٹھیکیداروں کی بے حسی پر گہرا طنز ملتا ہے۔

اردون دھتی رائے کا مذکورہ ناول، مسرت سے بصیرت کا سفر طے کرواتا ہے جس میں بیمار نظریات اور از کار رفتہ خیالات کے خلاف مزاحمت کی گئی ہے۔عدم برداشت اور تحمل سے عاری اس معاشرے کے لیے اس نے ''دنیا'' کا لفظ گھڑا ہے جو ناول کے مرکزی کردار انجم کی زبان سے ادا کرایا گیا ہے۔دنیا کے مدِ مقابل ''خواب گاہ'' اور ''جنت گیسٹ ہاؤس'' موجود ہیں جہاں انسان کا محض انسان ہونا دیکھا جاتا ہے، مذہب، ذات، برادری، علاقائی تعصب حتیٰ کہ جنس کے دائرے بھی بے معنی اور بے وقعت ہو کر رہ جاتے ہیں۔خواب گاہ کے مکین ایسے جسموں کے حامل ہیں جن میں مقدس روحیں قیام پذیر ہیں۔یہاں کا ہر فرد مامتا کے پر خلوص جذبے سے سرشار ہے، وہ جذبہ جہاں امید اور محبت کے سوا کچھ نہیں۔مذکورہ جذبے اور انسانیت کے عملی اظہار نے ہی ''جنت گیسٹ ہاؤس'' کو ''دنیا'' کے سامنے متضاد اکائی کے طور پر لا کھڑا کیا ہے۔''دنیا'' جہاں مختلف مذاہب، نسلوں، علاقوں، زبانوں اور رنگوں کی بنیاد پر انسانوں میں اختلاف موجود ہیں، وہیں ''خواب گاہ'' ان اختلافات سے ماورا ہے۔اس حوالے سے ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ارون دھتی رائے کے مذکورہ بیانیے کی تصدیق ہوتی ہے:۔

> ''خواب گاہ'' کے ساکنوں میں صرف میری ہی عیسائی تھی۔وہ چرچ نہیں جاتی تھی لیکن گلے میں ایک ننھی سی صلیب پہنے رہتی۔گڑیا اور بلبل ہندو تھیں اور کبھی کبھی مندروں میں ہو آتی تھیں جہاں اندر جانے دیا جائے۔باقی سب مسلمان تھیں۔وہ جامع مسجد جاتیں اور درگاہوں پر بھی جہاں اندرونی حجروں تک داخلے کی اجازت مل جائے۔''(۱)

یہاں کے مکین خالص انسانی بنیادوں پر ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کا خیال رکھتے ہوئے امن، محبت اور خوشحالی کے خواہاں ہیں۔''خواب گاہ''ہو یا''جنت گیسٹ ہاؤس'' کے افراد، ناانصافی، نفرت اور معاشرتی بے اعتدالیوں کے خلاف بطور استعارہ ناول میں سامنے آئے ہیں۔ناول میں '' خواب گاہ''اس لیے خواب گاہ کہلاتی ہے کہ اس میں خاص لوگ، خدا کی برکتوں کے حامل لوگ، اپنے ان خوابوں کے ساتھ رہنے

آتے ہیں جو دنیا میں سچ نہیں ہو سکتے۔ خواب گاہ میں آکر مقدس روحیں جو غلط جسموں میں قید ہیں، آزاد ہو جاتی ہیں۔''

انصاف اور انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر معاشرے کا قیام، یہ وہ انسانی خواہش ہے جو صدیوں سے مختلف مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کی صورت میں عیاں ہوتی رہی ہے۔ مثلاً ۱۶۸۸ء کا برطانوی انقلاب، ۱۷۷۶ء کا امریکی اعلانِ آزادی، آزادی، مساوات اوراخوت کی بنیاد پر برپا ہونے والا فرانسوی انقلاب، ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب اور ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ کا انسانی حقوق کا عالمی منشور وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ انصاف، آزادی اور امن کا خواب جس قدر پرانا ہے انسانی حقوق کی جدوجہد بھی اسی قدر پرانی ہے۔ اردون دھتی رائے نے بھی ''بے پناہ شادمانی کی مملکت'' میں اس خواب کو از سرِ نو دیکھا ہے اور معاشرے کے مراعات یافتہ طبقے کی چال بازیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے مفادات کے تحفظ اور موجودہ نظام کو تقویت دینے کے لیے قانونی، آئینی اور ثقافتی جواز گھڑتے رہتے ہیں۔ مذکورہ ناول میں مصنفہ نے محروم طبقے کی نظروں سے بھارت کی سیاسی، ثقافتی اور سماجی تاریخ کو جرأت مندانہ انداز سے دکھایا ہے جہاں رنگ، نسل، مذہب، جنس، دولت، زبان اور سماجی حیثیت کے امتیازات نمایاں ہوئے ہیں۔

''بے پناہ شادمانی کی مملکت'' میں عصرِ حاضر کی ثقافت اور تاریخ کو اس انداز سے فکشن کا حصہ بنایا گیا ہے کہ حاشیائی اور منحرف عناصر کی نشاندہی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ اس بات پر جملہ مفکرین متفق ہیں کہ ادب میں ثقافت اور تاریخ کے نشانات کی تعبیریں مخصوص حالات میں تغیر پذیر رہتی ہیں، اپنے عہد میں ان کی تعبیر کچھ ہوتی ہے اور بعد میں آنے والے دور میں کچھ اور، اس طرح وقت کے ساتھ یہ سلسلہ جاری وساری رہتا ہے۔ ثقافتی افتراقیت اور تاریخی سچائی کی اضافیت کے دروازے قاری کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ''بے پناہ شادمانی کی مملکت'' میں مصنفہ نے کئی ایسے کردار پیش کیے ہیں جو تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ ثقافتی اہمیت کے حامل بھی ہیں، جنھیں اپنے دور میں رد کیا گیا اور امتدادِ زمانہ نے انھیں مرجع خلائق بنا دیا۔ اس طرح کے کرداروں میں سے ایک کردار سرمد شہید کا ہے۔ ناول میں سرمد شہید کا ذکر اس وقت سامنے آتا ہے جب جہاں آرا بیگم کو آفتاب کے ماورائے جنس ہونے کا علم ہوتا ہے۔ جب مایوسی اور بے یقینی کی کیفیت میں جہاں آرا رحم

اور ہمدردی کی طالب تھی تو اس نے سرمد شہید کے دربار کا رخ کیا جو اس کے گھر سے دس منٹ کے فاصلے پر واقع تھا۔ اتنی قربت کے باوجود اس سے قبل وہ سرمد شہید کی تاریخی شخصیت سے ناواقف تھی لیکن وقت نے اسے ماضی کے اس کردار سے نا صرف شناسائی کا موقع فراہم کیا بلکہ ایقان کی اس سطح پر لا کھڑا کیا کہ اب وہی ہے جو اسے اس مشکل وقت سے بچا سکتا ہے۔ دلی میں اس تاریخی کردار کے حوالے سے عوام میں کئی فرضی کہانیاں مشہور تھیں لیکن سرمد کی حقیقت کم لوگوں کو معلوم تھی۔ ارون دھتی رائے نے ان کی کہانی کو ناول میں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ حقیقت کا بیان بھی ہے اور فکشن بھی۔ تاریخی طور پر دیکھا جائے تو سرمد شہید کا تعلق اورنگ زیب عالم گیر کے عہد سے ہے۔ وہ ایران کے شہر کاشان میں پیدا ہوئے اور تجارت کی غرض سے ہندوستان کے شہر ٹھٹھہ آئے جہاں وہ ہندو لڑکے ابھے چند کے عشق میں مبتلا ہوئے۔ از خود رفتگی کی اس کیفیت کو پہنچے کہ نہ اپنا ہوش رہا اور نہ اپنے قیمتی سامان کی کوئی پرواہ رہی۔ از خود رفتگی کی اسی حالت میں لاہور کے رستے دلی پہنچے جہاں دارا شکوہ سے ملاقات ہوئی، چوں کہ سرمد علمی اور ادبی شخصیت کے حامل تھے، اس لیے دارا شکوہ ان کی روحانی اور تخلیقی قوت سے متاثر ہوا، یوں یہ ملاقات جلد ہی قربت میں بدل گئی۔ سرمد کی قابلیتوں کا ذکر کرتے ہوئے عرش ملسیانی لکھتے ہیں:۔

> ''اس کے والدین ارمنی یہودی تھے۔ یہودیوں کی مقدس کتاب توریت اس نے بچپن میں ہی یاد کر لی تھی۔ جستجوئے علم اس کی جبلت تھی۔ توریت کے بعد بائبل اور عیسائیت کی دوسری کتابوں کا مطالعہ کیا، تشنگیٔ علم پھر بھی نہ بجھی تو اسلامی کتب کا مطالعہ کیا۔ عربی اور فارسی پر اسے پوری قدرت تھی۔ خوش نصیبی سے اسے ملاصدرالدین شیرازی سے اور ابولقاسم فندرسکی جیسے اساتذہ کامل مل گئے، چناں چہ انھی باکمال استادوں کی تعلیمات کے زیرِ اثر مشرف بہ اسلام ہوا۔ فندرسکی بہت آزاد خیال تھا اس لیے سرمد کی آزاد خیالی ایک ایسا ورثہ تھا جو اسے استاد سے ملا۔''**(۲)**

شہزادہ دارا شکوہ کے معتقد ہونے کی وجہ سے سرمد شاہی دربار میں عزت و احترام اور اثر و رسوخ کا حامل ٹھہرا۔ وہ لوگ جو دارا شکوہ سے حسد اور کینہ رکھتے تھے ان کی نظروں میں سرمد کھٹکنے لگا۔ اپنی ذہانت، تخلیقی جذبے اور روحانی قوت سے سرمد نے بہت جلد دلی کے عوام کے دلوں پر حکومت قائم کر لی جو دارا شکوہ کے مخالفین کو نامنظور تھی۔ کچھ عرصے بعد جب اورنگ زیب عالم گیر دارا شکوہ کو شکست دے کر

بر سرِ اقتدار آیا تو اس نے سرمد پر الزامات لگا کر اسے قتل کر دیا۔ سرمد کے قتل کی سیاسی، سماجی یا مذہبی جو بھی وجوہات ہوں، بہ ہر حال وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسے کردار کے طور پر موجود ہے جس پر لوگ صدیاں بیت جانے کے باوجود اعتماد اور اعتقاد رکھتے ہیں۔ جس طرح ان کے قتل کے موقع پر زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والوں کا جمِ غفیر موجود تھا اسی طرح آج بھی بلا تخصیصِ مذہب لوگ اُن کے دربار سے منسلک ہیں اور قلبی سکون تلاش کرتے ہیں:

> ''درگاہ جانے کے لیے جہاں آرا بیگم جب پہلے پہل بھیڑ سے گزریں۔۔۔عطر اور تعویذ فروش، زائرین کے جوتوں کے محافظ، اپاہج بھکاری، بے گھر بے در لوگ، عید پر ذبیحے کے لیے فربہ کیے جاتے بکرے، نیز بوڑھے ہیجڑوں کی پر سکون ٹولی جس نے درگاہ کے باہر ایک ترپال کے نیچے گھر بسا رکھا تھا....اور چھوٹے سے لال حجرے میں داخل ہوئیں تو انھیں قرار آگیا۔ سڑک کا شور مدھم پڑ گیا اور یوں لگنے لگا جیسے کہیں دور سے آرہا ہو۔''(۳)

جہاں آرا بیگم ایک کونے میں بچے کو لے کر بیٹھی یہ سارا منظر دیکھتی رہیں جس میں ہندو، مسلمان اور دیگر مذاہب کے لوگ مزار پر حاضری دیتے رہے اور جالیوں کے گرد لال دھاگے، کاغذ کی پرچیاں اور لال چوڑیاں باندھتے رہے۔ یہ لمحہ جہاں آرا بیگم کے لیے ایک پُرسکون لمحہ تھا جس میں امید بھی تھی اور احترام کا جذبہ بھی تھا۔امید اور احترام کا یہی جذبہ ہندوستانی تصوف کا خاصا ہے جو صوفی کے مریدین کے دلوں میں ہمہ وقت جا گزیں رہتا ہے۔ ناول میں آگے چل کر مصنفہ نے نظام الدین اولیاءاور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا ذکر بھی کیا ہے۔ سردیاں آنے پر انجم کی زینب کھانسی اور بلغم کی بیماری کا شکار ہوتی ہے اور انجم کو شک گزرتا ہے کہ اس پر سعیدہ نے سفلی جادو کیا ہے، وہ اسے نظام الدین اولیاء کی بارگاہ میں لے جاتی ہے، وہاں اسے ایک مجاور ملتا ہے جو اسے خواجہ غریب نواز کے دربار پر حاضری کا مشورہ دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے ناول مرکزی کردار کی داخلی کیفیات سے خارجی دنیا کا سفر طے کرتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہندوستانی تصوف میں تو اعلیٰ منصب پر فائز ہیں ہی سہی لیکن اپنے دور کی ظالم طاقتوں کے خلاف مزاحمت کی علامت بھی ہیں۔ آپ نے اس دور میں لوگوں کو امن و امان، بھائی چارے اور انصاف کا پیغام دیا جب اجمیر میں پرتھوی راج چوہان کا پر

آشوب دور اپنے عروج پر تھا۔ معاشرے میں اخلاقی، مذہبی اور روحانی قدریں تباہی کا شکار تھیں جس کا باعث حکمرانوں کی آپس کی خانہ جنگیاں تھیں، ان کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود کے بجائے خاندانی وقار اور خاندانی حکومت کو قائم رکھنا تھا، اسی اندرونی خلفشار اور بے امنی کے باعث بیرونی حملہ آور کامیابیاں حاصل کر رہے تھے۔ محمود غزنوی اور سلطان شہاب الدین غوری کے بیرونی حملے یہاں کی عوام کے دلوں میں اسلام کی حقیقی عظمت اجاگر نہ کر سکے۔ تنگ نظری، تعصب اور توہم پرستی کے اس دور میں خواجہ بندہ نواز ہی تھے جو انسانیت کا درس دے رہے تھے اور لوگ جوق در جوق ان کے پاس سے فیض حاصل کر رہے تھے۔ سسکتے اور بلکتے انسان، انسانیت کے نور سے تسکین پا رہے تھے۔ سید سلیم چشتی نے خواجہ غریب نواز کی تبلیغی اور روحانی سر گرمیوں کے بارے میں لکھا ہے:

> ''سرکار غریب نواز اور ان کے رفقاء اس ملک میں دنیاوی اقتدار کے حصول کے لیے نہیں آئے تھے۔ ان کے پاس کوئی ساز و سامان نہیں تھا۔ نہ ہتھیار تھے نہ فوج تھی۔ اس ملک میں ان کی آمد کا مقصد صرف اور صرف عوام کو گمراہی سے نکال کر سچائی اور محبت کی راہ پر لانا تھا۔''(۴)

ناول کا مرکزی کردار انجم، ذاکر میاں (جو اس کے والد کا دوست ہے اور احمد آباد اپنے سسرال جانا چاہ رہا ہے) کے ساتھ خواجہ غریب نواز کے دربار پر حاضری کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ خواجہ غریب نواز وہی ہستی ہیں جو پرتھوی راج چوہان کے عہد سے لے کر آج تک تمام دکھی انسانیت کے دلوں پر مرہم رکھنے کا کام کر رہے ہیں۔ انجم نے بھی اپنی زینب کی سلامتی اور صحت یابی کے لیے ایک ہزار روپے کی سبز چادر اجمیر شریف کے دربار پر چڑھائی اور ذاکر میاں کے ہمراہ احمد آباد روانہ ہو گئی جہاں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے جو ذاکر میاں کی موت اور انجم کی عجیب طرز کی نفسیاتی کیفیات پر منتج ہوئے۔ گجرات کے ان فسادات نے انجم کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتسم کیے اور بقیہ تمام عمر اس نے قبرستان میں منتقل ہو کے ان ہی کے زیر اثر گزاری۔ ۲۰۰۲ء میں گجرات میں رونما ہونے والے ان فسادات کی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پولیس نے ان کو روکنے میں حصہ نہیں لیا بلکہ اس وقت کے وزیرِاعلیٰ نریندر مودی نے ان کی باقاعدہ سرپرستی کی۔ وفاق میں موجود بھارتیہ جنتا پارٹی نے بھی ان فسادات کی روک تھام میں کوئی خاطر خواہ دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ

نکلا کہ اڑھائی ہزار مسلمان قتل ہوئے اور کچھ کو زندہ آگ میں جلا دیا گیا، سیکڑوں مسلمان خواتین کی عزتیں لوٹی گئیں، ہزاروں مسلمان بے گھر ہوئے اور سیکڑوں بے گناہ مسلمانوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔اس سے قبل ۱۹۶۹ء میں بھی گجرات میں ہندو مسلم فسادات ہوئے تھے جو ۱۹۸۹ء میں بھاگلپور کے فسادات تک بھارت کے سب سے بڑے فسادات خیال کیے جاتے تھے۔ ۲۰۰۲ء کے ان فسادات کا نقشہ ناول میں کچھ یوں کھینچا گیا ہے:

> ''قتلِ عام کا یہ سلسلہ ہفتوں تک جاری رہا۔ یہ صرف شہروں تک محدود نہ تھا۔ لوگوں کا جنونی ہجوم تلواروں اور ترشولوں سے لیس تھا اور ان کے سروں پر بھگوا پٹیاں بندھی ہوتی تھیں۔ ان کے پاس مسلم گھرانوں، کاروباروں اور دکانوں کی املاک کی سرکاری فہرستیں تھیں۔ انھوں نے گیس سلنڈر جمع کر رکھے تھے (جس سے چند ہفتے پہلے ہونے والی گیس کی قلت کی وضاحت ہوتی ہے)۔ اگر زخمی لوگوں کو ہسپتال لے جایا جاتا تو بھیڑ ہسپتالوں پر بھی حملے کرتی تھی۔ پولیس مقدمے درج نہیں کر رہی تھی۔ انھوں نے کہا، خاصی معقول بات، کہ وہ پہلے لاشیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ بنیادی بات یہ تھی کہ اکثر پولیس اسی بھیڑ کا حصہ ہوتی تھی اور جب بھیڑ اپنا کام کر چکتی تو لاشوں میں لاشوں جیسی کوئی شباہت نہیں رہ جاتی تھی۔''(۵)

ناول کا مذکورہ اقتباس حکومت کے اقلیت کے ساتھ جانبدار رویے کو آشکار کرتا ہے، جہاں نہ صرف مقتدر شخصیات بے حسی کا شکار ہیں بلکہ لالچ اور ہوس کے نتیجے میں سماج تصادم کا شکار ہے۔ حکمران منظم سیاسی اور سماجی ہلچل پیدا کر کے اپنے اقتدار کو طول دینے کے خواہاں ہیں اور عوام کی اکثریت لالچ اور ہوس سے مغلوب ہو کر اقلیت پر ظلم کے کوہِ گراں ڈھانے میں عار محسوس نہیں کر رہی۔ خود غرضی، مفاد پرستی اور انانیت نے انسانی رشتوں کو پامال کر دیا ہے۔ خود کو سیکولر گرداننے والی ریاست کیسے ایک مذہبی طبقے کو دیگر مذہبی طبقوں پر ظلم اور تشدد روا رکھنے کی اجازت دے سکتی ہے؟ لیکن ہندوستانی ریاست کا یہ دوغلا رویہ ۲۰۰۲ء کے ان فسادات میں سامنے آیا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار انجم کے احساسات اور اس کی حالتِ زار سے ارون دھتی رائے نے اس واقعے کو قاری سے روشناس کرایا ہے۔ کٹے بالوں اور پھٹے کپڑوں والی انجم جب خواب گاہ واپس لوٹتی ہے تو وہ خوف و دہشت کے مارے نفسیاتی ہیجان کا شکار ہے اور زینب کو ''گائتری منتر'' سکھانے پر بضد ہے۔ اس نے یہ منتر گجرات کے کیمپ میں سیکھا تھا تاکہ اگر وہ بھگوا ہجوم میں گھر جائے تو زندہ بچنے کے لیے اس کو

پڑھ کر خود کو ہندو بتا سکیں۔ یہ ساری صورتِ حال بھارت کے سیکولر اور جمہوری ریاست ہونے پر سوالیہ نشان ہے۔

ناول کا مرکزی کردار انجم بھی دلی کی ایک حقیقی شخصیت مونا احمد پر تشکیل دیا گیا ہے۔ مونا احمد کی کہانی اس وقت سامنے آئی جب برطانوی اخبار ''دی ٹائمز'' (The Times) کے پروجیکٹ میں کام کرنے والے فوٹو گرافر دیانیتا سنگھ (Dayanita Singh) نے "Myself Mona Ahmad" کے عنوان سے کتاب تحریر کی۔ اس کتاب میں انھوں نے بتایا ہے کس طرح مونا احمد نے باپ کے خوف سے گھر کو خیر باد کہا، اپنے طبقے کے افراد کے ساتھ کچھ وقت گزارا اور پھر دلی کے قبرستان میں رہائش اختیار کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس نے اپنے اور اپنی محسن جہاں آرا کے لیے وہاں مکان تعمیر کیا اور لگ بھگ تین دہائیوں تک وہ معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے افراد کو پناہ دیتی رہی۔ ناول کے مرکزی کردار انجم اور مونا احمد میں اتنی مماثلتیں موجود ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ نے مونا احمد کے کردار ہی کو مدِ نظر رکھ کر انجم کا کردار تشکیل دیا ہے۔ مونا احمد کو اولاد کی اتنی خواہش تھی کہ اس نے حج پر جا کر اللہ سے دعا مانگنے کا عزم کیا لیکن اس کی یہ خواہش اس وقت پوری ہو گئی جب ایک عورت بچے کو جنم دیتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور اس نے اس بچے کو گود لے لیا، جس کا نام اس نے عائشہ رکھا۔ اسے عائشہ سے اولاد کی طرح محبت تھی یہی وجہ ہے کہ وہ اس کی سالگرہ کی شاندار پارٹیوں کا اہتمام بھرپور انداز میں کرتی۔ انجم بھی اسی جذبے سے سرشار ہے، پہلے زینب اور بعد ازاں مس جبیں دوم اس کی توجہ کا مرکز ہیں۔ زینب کے لیے تو اس کے دل میں حقیقی ماں سے بھی زیادہ درد اور احساس موجود تھا۔ مونا احمد کے گرو چمن کو یہ بات پسند نہ تھی۔ اس نے عائشہ کو اغوا کرایا اور پاکستان بھیج دیا جس سے مونا احمد ایک اور صدمے کا شکار ہوئی جس نے اس کی شخصیت میں اپنے طبقے سے بغاوت پیدا کی اور وہ قبرستان میں منتقل ہوئی۔ انجم بھی اپنی زینب سے کچھ عرصے کے لیے فسادات میں بچھڑ جاتی ہے لیکن لوٹنے پر اسے زینب مل جاتی ہے جسے وہ اب پہلے سے بھی زیادہ عزیز رکھنے لگتی ہے۔

مونا احمد کو جانوروں سے بے حد پیار تھا اس نے قبرستان میں کتے، بندر، خرگوش، بکریاں اور بطخیں پال رکھی تھی۔ ناول میں یہی رویہ انجم کے کردار میں بھی موجود ہے، وہ نہ صرف حاشیے پہ موجود انسانوں سے پیار کرتی ہے بلکہ جانوروں کو بھی پناہ دینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی۔ اس حوالے سے ناول کا ایک اقتباس

ملاحظہ ہو:

> ''زینب اور صدام دونوں نے مل کر قبرستان کو چڑیا گھر میں بدل دیا تھا۔ زخمی جانوروں سے بھری کشتی نوح۔ ایک مور تھا، اور ایک مورنی جو شاید اس کی ماں تھی جو اسے چھوڑ کر نہ جاتی۔ تین بوڑھی گائیں جو سارا دن سوتی رہتی تھیں۔ ۔۔ ایک چھوٹا سا کچھوا تھا۔۔۔ ترک شدہ پالتو کچھوا۔۔۔ جو صدام کو ایک پارک میں ملا تھا، اور جس کے ایک نتھنے میں تپتپیا گھاس کا تنکا گھسا ہوا تھا، اب کیچڑ بھرے گڑھے میں اس کا اپنا مسکن تھا۔ پایل گھوڑی کے ساتھی کے طور پر اب ایک لنگڑا گدھا اس کے پاس تھا۔ وہ مہیش کہلاتا تھا، مہیش ہی کیوں، کوئی نہیں جانتا تھا۔ بیر و بوڑھا ہوتا جا رہا تھا لیکن اس کی اور کامریڈ لالی کی اولادیں کئی گنا بڑھ چکی تھیں اور اب یہ پلے ہر جگہ اینڈتے پھرتے تھے۔ کئی بلیاں آئیں اور چلی گئیں، اسی طرح جیسے جنت گیسٹ ہاؤس میں مہمان آتے اور جاتے رہتے ہیں۔''(۶)

انجم اور مونا احمد میں مماثلتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ ارون دھتی رائے نے انجم کے کردار کی تشکیل میں مونا احمد کو مدِ نظر رکھا ہے۔ مونا احمد نے بچوں کے لیے دلی کے مہندیاں قبرستان میں کمرے تعمیر کرائے، نہانے اور تیرنے کے لیے تالاب بنوایا لیکن بدقسمتی سے کمرے اور تالاب کبھی مطلوبہ مقصد کے لیے استعمال نہ ہو سکے۔ ناول میں یہی کام انجم بھی کرتی ہے لیکن تعمیر شدہ تالاب میں نہ تو پانی بھرا جا سکا اور نہ اسے نہانے کے لیے استعمال کیا جا سکا۔

ارون دھتی رائے نے ہم عصر تاریخی شخصیات میں سے نریندر مودی کو للا کے روپ میں ناول کا حصہ بنایا ہے جو ان دنوں بھارت کے وزیرِ اعظم ہیں۔ اس سے قبل وہ گجرات کے وزیرِ اعلیٰ رہ چکے ہیں جنھوں نے اپنی سیاست کا آغاز ہندو قوم پرست تنظیم آر ایس ایس (راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ) سے کیا اور بعد ازاں بھارتیہ جنتا پارٹی میں شامل ہو گئے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی، آر ایس ایس کی ہم خیال تنظیم تصور کی جاتی ہے۔ آر ایس ایس کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہ تنظیم بھارت میں فسادات برپا کرنے والی تنظیموں میں سرِ فہرست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۹ء میں احمد آباد کے فسادات، ۱۹۷۱ء کے تلشیری فسادات، ۱۹۷۹ء میں جمشید پور میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور بابری مسجد کا انہدام وغیرہ میں ملوث ہونے پر مذکورہ تنظیم کو متعدد تحقیقی کمیشنز کی

جانب سے سرزنش کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ نریندر مودی کو ۲۰۰۱ء میں اس وقت گجرات کے وزیرِ اعلیٰ بننے کا موقع ملا جب کیشو بھائی پٹیل مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ۲۰۱۴ء تک گجرات کا وزیرِ اعلیٰ رہا۔ نریندر مودی کی حکومت میں ۲۰۰۲ء میں ہندو مسلم فسادات وقوع پذیر ہوئے جن کا ذمہ دار مختلف انسانی حقوق کی تنظیمیں، نریندر مودی کو ٹھہراتی ہیں۔ یہ فسادات اس وقت رونما ہوئے جب گودھرا میں ریل آتش زدگی کا واقعہ ہوا اور اس میں اُنسٹھ (۵۹) افراد جاں بحق ہوئے۔ شواہد سے پتا چلتا ہے کہ نریندر مودی کی حکومت درپردہ ان فسادات کی حمایت کر رہی تھی۔ ریاستی پولیس نے بھی نہ ان فسادات کو روکنے کی کوشش کی اور نہ مقدمات درج کیے۔ ان فسادات میں، حکومتی اعداد و شمار کے مطابق ایک ہزار لوگ مارے گئے، دو سو لاپتا ہوئے اور اڑھائی ہزار زخمی ہوئے۔ ایک ہزار مرنے والے افراد میں سات سو نوے مسلمان تھے اور صرف دو سو چون ہندو تھے۔ حالاں کہ غیر سرکاری تنظیمیں مرنے والوں اور زخمیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ بتاتی ہیں۔ ان اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی نسل کشی تھی۔ ہندو قوم پرست دراصل ایسے حالات پیدا کر کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں نفاق پیدا کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ اس میں ان کی سیاسی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ دوسری جانب مسلمان اسے پرایا ملک خیال نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے اجداد نے اسے اپنے خون سے سینچا ہے۔ وہ اس ملک میں پناہ گزین نہیں بلکہ یہاں کے معزز شہری ہیں۔ موجودہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے اس مؤقف سے اتفاق نہیں کرتی، وہ اس بات کی قائل ہے کہ بیرونی نسلیں ہندو تہذیب اور زبان کو اختیار کریں۔ اپنی الگ شناخت اور تشخص ختم کر کے خود کو ہندو نسل میں ضم کریں، نہیں تو ہندو راشٹر کے ماتحت بن کر رہیں اور کسی حق کا دعویٰ نہ کریں۔ ان کے نزدیک وہی نیشنلسٹ اور محبِ وطن ہیں جو ہندو ہیں، باقی سب غدار ہیں اور ملک دشمن ہیں۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر، ہندو راشٹر واد کے سراسر خلاف تھے۔ اب آر ایس ایس ان کو بھی ہندوتوا کا نمایندہ گرداننے لگی ہے۔ اس کا حوالہ یشونت سنگھ کی کتاب ''جدید ہندوتری مورتی'' میں موجود ہے۔ حالاں کہ امیڈکر نے اپنی زندگی میں ہمیشہ ہندوتوا کی مخالفت کی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں اسے سماج کے لیے لعنت قرار دیا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے گوتم بدھ اور مہاویر جین کو وشنو کا اوتار بنا دیا گیا، جب کہ حقیقت میں انھوں نے ہندو مذہب سے بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ ہندوا ایسا محض اس لیے کر رہے ہیں کہ ہندوتوا کو فروغ دے سکیں۔ اس ساری صورتِ حال کو اروندھتی رائے نے بین السطور ناول کا حصہ بنایا ہے اور گجرات

فسادات کے ذیل میں مختلف کرداروں کے توسط سے اس کو قاری پر آشکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ان فسادات سے ذاکر میاں، اس کا بیٹا منصور، زینب، سعیدہ، ناول کا مرکزی کردار انجم اور خواب گاہ میں موجود اس کے ساتھی جس شدت سے متاثر ہوئے ہیں، اس کے اثرات ناول کے اختتام تک کسی نہ کسی صورت موجود ہیں۔

> ''گجرات کا وزیر اعلیٰ جو سنگھٹن کا وفادار رکن تھا(جیسا کہ وزیرِ داخلہ اور وزیرِ اعظم بھی تھے)ان دنوں انتخابات کی تیاریاں کر رہا تھا۔وہ بھگوا کرتا پہنے اور ماتھے پر سیندور کا لمبا تلک لگائے، ٹیلی ویژن پر نمودار ہوا اور اپنی سرد، مردہ آنکھوں کے ساتھ حکم دیا کہ ہندو یاتریوں کی جلی ہوئی لاشیں ریاستی راجدھانی احمد آباد لائی جائیں جہاں انھیں جنتا کے درشن کے لیے رکھا جائے گا تاکہ لوگ انھیں شردھانجلی دے سکیں۔ایک لومڑی نما'غیر سرکاری' ترجمان نے غیر سرکاری طور پر اعلان کیا کہ ہر عمل کا جواب مساوی اور معکوس ردِ عمل کے ساتھ دیا جائے گا۔''(۷)

گجرات فسادات نے ناول کے مرکزی کردار انجم کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ ''خواب گاہ'' سے قبرستان کے ویرانے میں ''بے پناہ شادمانی کی مملکت'' تشکیل دینے پر مجبور ہوا جسے ''جنت گیسٹ ہاؤس'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ جنت گیسٹ ہاؤس وہ جگہ ہے جہاں ناول کے تقریباً ہر کردار کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور یوں انجم کے کردار کو ناول میں مرکزی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

مذکورہ ناول میں بھارت کی ہم عصر تاریخ کو کرداروں اور واقعات کے تانے بانے میں جس طرح منقلب کیا گیا ہے، اس پر غور کریں تو مختلف واقعات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ ناول کے آغاز میں ہی جب انجم اور زینب کے مابین ماماتا جیسا بے لوث تعلق قائم ہوتا ہے تو وہ اسے کھلونے خرید کر دیتی ہے، اسے نہلاتی ہے، بار بار کپڑے بدلتی ہے، چوٹی باندھتی ہے، تیل لگاتی ہے، اسے سیر کرنے کے لیے باہر لے جاتی ہے اور ہر رات اسے کہانیاں بھی سناتی ہے۔ انجم جو کہانی اسے شوق سے سناتی ہے وہ فلائی اوور کی کہانی ہے۔ فلائی اوور کی کہانی سچی کہانی تھی لیکن اس سچائی کی تلخی کو دلفریبی اور دلکشی میں بدلنے کے لیے وہ ایک مخصوص حصے کو حذف کر دیتی تھی۔ وہ حصہ ۱۹۷۶ء میں بھارت میں اندرا گاندھی کی لگائی ہوئی ایمرجنسی تھی اور اس رات وہ کسی شادی کی تقریب میں شامل تھی۔ پولیس نے نہ صرف شادی کی محفل کو درہم برہم کیا بلکہ مہمانوں اور میزبانوں میں سے

کچھ کو بلاجواز گرفتار بھی کر لیا گیا۔ انجم اور اس کے ساتھیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اگر تن فروشی اور فحاشی کے الزام سے بچنا چاہتی ہیں تو فوراً وہاں سے رفو چکر ہو جائیں۔ انجم مع اپنی سہیلیوں کے خوف اور دہشت کے عالم میں وہاں سے بھاگ نکلی۔ یہ رات انجم کے لیے ہی نہیں بلکہ بھارت کے جملہ عوام کے لیے بھی اذیت ناک تھی۔ پولیس نے درندگی اور وحشت کی تمام حدود کو پار کر دیا۔ اذیت اور تکلیف دینے کا کوئی حربہ نہ چھوڑا گیا۔

سنجے گاندھی کی مطلق العنانی اور اقتدار پر مکمل گرفت نے بھارت کی جمہوری اقدار کو مکمل طور پر پامال کر دیا تھا جس کی مخالفت نہ صرف حزب اختلاف کر رہی تھی بلکہ کانگرس پارٹی کے اندر بھی سنجے گاندھی کے خلاف آوازیں اٹھنا شروع ہو گئی تھیں کیوں کہ سنجے گاندھی نے حکومت اور پارٹی کے اُمور پر مطلق العنانی کی حد تک اثر ورسوخ بڑھا لیا تھا۔ اسی دوران میں جئے پرکاش نارائن نے صورتِ حال کا فائدہ اٹھایا اور سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کر دیا۔ پورے ملک میں اس تحریک کے اثرات کو محسوس کیا جانے لگا۔ ان حالات کے پس منظر میں اس وقت کے چیف منسٹر مغربی بنگال سدھارتھ شنکر رے نے اندرا گاندھی کو ایمر جنسی کا مشورہ دیا۔ مسز گاندھی نے ۲۴ جون ۱۹۷۵ء کو صدرِ جمہوریہ سے ایمر جنسی کے نفاذ کی سفارش کر دی۔ ایمر جنسی کے نافذ ہوتے ہی واجپائی، جارج فرنانڈیز، مرارجی دیسائی ایسے نمایاں لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ وی سی شکلا کو وزیرِ اطلاعات و نشریات مقرر کیا گیا جنھیں اس دور کا بھارتی گوبلز کیا گیا جو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر پیش کرنے میں ماہر تھا۔ اس ایمر جنسی کے حوالے سے ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مثلاً فلائی اوور والی کہانی سے جو حصہ ایڈٹ کر کے نکال دیا گیا تھا، یہ تھا کہ یہ واقعہ ۱۹۷۶ء میں پیش آیا تھا۔ اندرا گاندھی کی لگائی ہوئی ایمر جنسی جو اکیس مہینے چلی، اپنے عروج پر تھی۔ اس کا بگڑا بیٹا سنجے گاندھی یوتھ کانگرس کا سربراہ تھا اور ملک کو تقریباً وہی چلا رہا تھا، کچھ یوں جیسے ملک نہ ہو، اس کا کھلونا ہو۔ عوامی حقوق سلب کر لیے گئے تھے۔ اخبار سنسر کیے جاتے تھے اور آبادی کو کنٹرول کرنے کے نام پر ہزاروں آدمیوں کو گھیر کر (جو بیشتر مسلمان تھے) کیمپوں میں پہنچایا جا رہا تھا اور ان کی نس بندی کی جا رہی تھی۔ ایک نیا قانون Maintenance of Internal Security Act (داخلی تحفظ بنائے رکھنے کا قانون) بنایا گیا جس نے حکومت کو یہ اختیار دیا تھا کہ معمولی شک کی بنیاد پر بھی، جسے چاہے گرفتار کر لے۔ جیلوں میں جگہ نہیں بچی تھی اور

سنجے گاندی کے حواریوں کی ایک نئی منڈلی عوام پر مسلط تھی جو اس کے احکامات کی تعمیل میں لگی ہوئی تھی۔''(۸)

ایمر جنسی کی یہ صورتِ حال انیس ماہ تک جاری رہی جسے ہندوستان کی تاریخ کا بد ترین دور کہا جاتا ہے۔اس عرصے میں عوام کو ہر طرح کے مظالم برداشت کرنا پڑے۔اس دور میں سنجے گاندھی نے خاندانی منصوبہ بندی کے تحت نس بندی کا اطلاق کیا۔ سرکاری اہل کار اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کی خاطر حد سے تجاوز کرنے لگے اور غیر شادی شدہ لڑکے اور لڑکیوں کی بھی نس بندی کی جانے لگی۔ایک اندازے کے مطابق ایک سال (۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۷ء) میں تیراسی لاکھ افراد کی نس بندی کی گئی،اس دوران میں نس بندی کے ناقص طریقوں کے باعث درجنوں افراد کی ہلاکتیں بھی ہوئیں۔ایمر جنسی کے دوران میں ہی دہلی کے کچی آبادی کے علاقوں میں یہ دیکھے بغیر بلڈوز چلائے گئے کہ ان میں کوئی انسان موجود بھی ہے یا نہیں۔ریپڈ ایکشن فورس نے ریگولر پولیس کے ساتھ مل کر لوگوں کے ساتھ جو جبری کارروائیاں کیں ان کا حال ناول میں کچھ اس طرح بیان ہوا ہے،اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ ہو:

''لیکن اس کے بجائے ان کے گھر،ان کے دروازے اور کھڑکیاں،ان کے چھپر،ان کے برتن بھانڈے،ان کی پلیٹیں،ان کے چمچ،ان کے سکول چھوڑنے کے سرٹیفکیٹ،ان کے بچوں کے سکول، ان کی زندگی بھر کی کمائیاں، ان کی آنکھوں کے تاثرات،آسٹریلیا کے امپورٹڈ پیلے بلڈوزروں سے پیس دے دے گئے(جو ڈِچ وچ، کھڈ وڈھڈ کہلاتے تھے،وہی بلڈوزر)۔یہ جدید ترین مشینیں تھیں۔ان سے تاریخ کو بھی پیسا جا سکتا تھا اور بلڈنگ میٹریل کے مانند ان کا بھی ڈھیر لگایا جا سکتا تھا۔''(۹)

دہلی میں بے گھر ہونے والے افراد سے بجائے ہمدردی کا سلوک کرنے کے میڈیا نے لائیو ٹیلی کاسٹنگ کے ذریعے مزید مایوسی پھیلائی۔دہلی میں بھوکوں اور بے گھر افراد کے بھیک مانگنے پر بھی پابندی عائد کی گئی۔ہزاروں بھکاریوں کو گھیر کر باڑوں میں بند کیا گیا اور پھر گروہوں میں انھیں شہر سے باہر منتقل کیا گیا۔انھیں واپس آتے آتے بھی دلالوں کو کثیر رقم چکانی پڑی۔

بھارت کی ہم عصر تاریخ میں دسمبر ۱۹۸۴ء میں بھوپال کاربائیڈ گیس کا واقعہ کسی ذی شعور کی نظروں سے اوجھل نہیں، تقریباً چار دہائیاں گزرنے کے باوجود ابھی تک متاثرہ واقعے کے ذمہ داروں کو نہ تو سزا ہوئی اور

نہ متاثرین کو ان کا حق ملا۔ بھارت کی تاریخ کا یہ ایسا واقعہ ہے کہ جس کی تفصیلات جان کر حساس آدمی کا دل دہل جاتا ہے۔ سخت سردی کے موسم میں، رات بارے بجے، جب لوگ اپنے گھروں میں سکھ کی نیند سو رہے تھے۔ کھاد بنانے والی فیکٹری سے زہریلی گیس (میتھائیل اسو سائنیٹ Methyl Isocyanate) چاروں اطراف پھیلنا شروع ہو گئی، عوام اس کے زہریلے اثرات کی لپیٹ میں آ گئے۔ لوگوں کی بڑی تعداد نیند سے بیدار نہ ہو پائی اور جو بیدار ہوئے وہ بھاگتے بھی تو کہاں جاتے؟ متاثرین کی کثیر تعداد، فیکٹری کے گرد و نواح میں رہائش پذیر کچی آبادیوں کے مکین تھے، لیکن مجموعی طور پر بھوپال کا پورا شہر زہریلی گیس سے متاثر ہوا۔ حکومتی اعداد و شمار کے مطابق اس حادثے میں چار ہزار افراد کی جان گئی، لیکن دیگر ذرائع کا کہنا ہے کہ پہلے بہتر گھنٹوں میں مرنے والوں کی تعداد آٹھ سے دس ہزار کے قریب تھی جب کہ بعد میں زہریلی گیس کی پیچیدگیوں سے مرنے والوں کی تعداد پچیس ہزار سے زیادہ ہے۔ اس گیس کے اثرات طویل عرصہ گزرنے کے بعد اب بھی محسوس کیے جاتے ہیں۔

مرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انھیں اجتماعی قبروں میں دفن کیا گیا اور وہ جو کسی طرح اس آفت سے بچ نکلے تھے ان کو ابتدائی طبّی امداد نہ ملنے کے باعث ذہنی اور جسمانی معذوری کا سامنا کرنا پڑا، وہ آج تک اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ سالوں گزرنے کے باوجود بہت سے بچے اب بھی ذہنی اور جسمانی طور پر معذور پیدا ہوتے ہیں۔ اس فیکٹری کی وجہ سے زیرِ زمین پانی اتنا آلودہ ہو چکا ہے کہ وہ سلو پوائزننگ کا کام کرتا ہے۔ اس تباہ کن اور قابلِ افسوس صورتِ حال کے باوجود فیکٹری کے مالکان کے خلاف نہ کوئی بھرپور قانونی کارروائی ہوئی اور نہ متاثرین کی داد رسی ہو پائی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یونین کاربائیڈ کثیر قومی کمپنی ہے۔ اس کا سربراہ امریکی سرمایہ دار وارین اینڈرسن ہے جس کا اثر ورسوخ پوری دنیا میں ہے۔ متاثرین نے اس کے خلاف بھرپور قانونی جنگ لڑی لیکن ان کو خاطر خواہ معاوضہ نہیں مل پایا۔ ۱۹۸۹ء میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے تحت مذکورہ کمپنی چار سو ستر ملین ڈالر متاثرین کو بطور معاوضہ ادا کرنے پر راضی ہوئی لیکن رقم کا تعین کرتے ہوئے متاثرین کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی اور مرنے والوں کی تعداد پچیس ہزار سے بھی بڑھ گئی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اگر یہ معاوضہ امریکی معیارات پر دیا جاتا تو کمپنی کو دس ارب ڈالر کی رقم ادا کرنا تھی۔ بھارت کی تاریخ کا یہ ایک اہم واقعہ ہے جس کے متاثرین کی آواز، ارون دھتی رائے نے ناول میں بلند

کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول میں جہاں جنتر منتر کے مقام پر ہونے والے احتجاج میں مختلف طبقہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے اپنے دکھ کا رونا رو رہے ہیں، وہیں یونین کاربائیڈ گیس کی لیکج کے متاثرین بھی موجود ہیں جن کا حال ناول نگار نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''گنجے آدمیوں کے قریب پٹڑی کا خاصا بڑا حصہ گھیرے ہوئے ہزاروں لوگوں کے پچاس نمائندے بیٹھے تھے جنھیں بھوپال میں ۱۹۸۴ء کی یونین کاربائیڈ گیس لیک نے اپاہج کر دیا تھا۔ وہ اس پٹڑی پر گزشتہ دو ہفتوں سے بیٹھے تھے۔ ان میں سے سات غیر معیادی بھوک ہڑتال پر تھے اور ان کی حالت بڑی تیزی سے خراب ہو رہی تھی، معاوضے کا مطالبہ لے کر اس جھلسا دینے والی گرمی میں وہ ہزاروں میل چل کر اس بھوپال سے دہلی آئے تھے :اپنے لیے، نیز مسخ شدہ بچوں کی اگلی نسل کے لیے جو گیس خارج ہونے کے بعد پیدا ہوئی تھی، صاف پانی اور طبّی سہولتوں کا مطالبہ لے کر۔۔۔''(۱۰)

یونین کاربائیڈ گیس کا مذکورہ مسئلہ طویل عرصہ گزرنے کے باوجود بھارتی حکومت حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ متاثرین کی فلاح اور ان کے حقوق پر کام کرنے والی تنظیمیں یونین کاربائیڈ گیس کے موجودہ مالک (وارن اینڈرسن کی موت کے بعد) ڈاؤ کیمیکل کے ساتھ ساز باز کا الزام لگاتی رہتی ہیں بھارتی عدالتوں نے وارن اینڈرسن کو مفرور بھی قرار دیا لیکن امریکی حکومت نے انھیں بھارت کے حوالے نہیں کیا۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ امریکہ دوغلی پالیسی کا شکار ہے وہ چاہے تو کسی دوسرے ملک میں اسامہ بن لادن کو ہلاک کر سکتا ہے اور وارنٹ گرفتاری ہونے کے باوجود وارن اینڈرسن جو اسامہ سے بھی زیادہ ہلاکتوں کا ذمہ دار ہے، اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دے سکتا ہے۔

ناول میں جنتر منتر کے اس مقام پر اس طرح کی کئی اور تنظیمیں بھی موجود ہیں جو اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کر رہی ہیں۔ ان میں ''صفائی کرمچاری یونین'' جو کوڑے اور نالیوں کو کارپوریٹ کے حوالے کرنے پر احتجاج کر رہے ہیں، کباڑیوں کی ایسوسی ایشن اور بنگال میں پیٹرو کیمیکل کارپوریشن کے خلاف بھوک ہڑتالی، کشمیری ماؤں کی انجمن جن کے بچے لاپتا تھے وغیرہ۔ اس کے علاوہ وہ بوڑھا آدمی بھی موجود ہے جو بھارت کے مختلف کرپشن کے سکینڈلوں کے خلاف بھوک ہڑتال پر تھا۔ ناول کے اس کردار میں انّا ہزارے کی جھلک خاص طور پر

نمایاں ہوئی ہے جو کرپشن کے خلاف بھوک ہڑتالیں کرنے میں معروف ہے۔ نئی دہلی کے رام لیلا میدان میں اس وقت کے وزیرِ اعظم منموہن سنگھ کے خلاف ان کی پندرہ روزہ بھوک ہڑتال کسی سے اوجھل نہیں۔ اس بھوک ہڑتال کے وقت ان کی عمر ۷۴ سال تھی اور وہ ملک میں بدعنوانی کے خلاف سخت قوانین کا مطالبہ کر رہے تھے۔ منموہن سنگھ کی حکومت کو درپیش کئی کرپشن کے الزامات میں سے بڑا سکینڈل انتالیس بلین ڈالر کا ٹیلی کام سکینڈل بھی تھا۔انا ہزارے حکومت کی طرف سے ٹھوس کارروائی اور وزرا کے استعفوں کا مطالبہ کر رہا تھا۔ ناول میں موجود بوڑھے آدمی کے کردار کے ذریعے دراصل انا ہزارے کی جدوجہد کی طرف اشارہ موجود ہے۔اس دوران میں جن کرپشن سکینڈل کو سامنے لایا گیا ان کا بیان ناول میں یوں موجود ہے:

> ''بوڑھے کے ہاتھ میں کوئی رگ آگئی تھی۔ شہر کی بیداری کا یہ موسم گرما گھوٹالوں کا بھی موسم تھا۔ کوئلہ گھوٹالے، خام لوہے کے گھوٹالے، رہائشی مکانات کے گھوٹالے، انشورنس گھوٹالے، اسٹامپ پیپر گھوٹالے، فون لائسنس گھوٹالے، زمین گھوٹالے، باندھ گھوٹالے، سینچائی گھوٹالے، اسلحہ اور گولہ بارود گھوٹالے، پٹرول پمپ گھوٹالے۔۔۔ کار نمبر پلیٹ گھوٹالے، ووٹر لسٹ گھوٹالے، شناختی کارڈ گھوٹالے۔۔۔ جن میں سیاسی نیتا، بزنس مین سیاست دان اور سیاست دان بزنس مین، عوامی دولت کو ناقابلِ تصور مقدار میں لوٹ چکے تھے۔''(۱۱)

بھارت کی حکومت کی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کی قلعی کھولنے میں اردون دھتی رائے نے بوڑھے آدمی، للا، اگروال اور آزاد بھارتیہ کے کرداروں کے ذریعے مہارت سے کام لیا ہے اور ان مسائل کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق براہِ راست عوام سے ہے۔انھوں نے عوامی مسائل کو بلند مقام سے دکھانے کے بجائے نچلی سطح اور عام انسانوں کے زاویۂ نظر سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔اس کوشش کا نتیجہ ہے کہ عام آدمی جو پہلے تاریخی فکشن میں نظرانداز ہوتا رہا ہے وہ بھارتی تاریخ میں اہم قوت بن کر ابھرا ہے۔ ناول نگار نے تاریخ کو نچلی سطح سے دیکھنے اور دکھانے کا جو اسلوب پیش کیا ہے اس کے نتیجے میں ان لوگوں کی دریافت آسان ہو گئی ہے جو تاریخ کے دھارے میں کہیں حاشیے پر موجود تھے، جن کو یا تو قابلِ توجہ ہی نہیں سمجھا گیا یا جن کے لیے فکشن میں ایک آدھ جملہ لکھ کر فرض ادا کر لیا جاتا تھا۔ارون دھتی رائے کے اس زاویۂ نگاہ سے بھارتی تاریخ کے سقم اور کمزوریاں نمایاں ہوئی ہیں۔

اروندھتی رائے نے ''بے پناہ شادمانی کی مملکت'' میں کشمیر کی صورتِ حال کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ وہ کشمیر جس کے بارے میں آج سے ستر سال پہلے اس وقت کی حکومت نے معاہدہ کیا تھا اور انھیں قانونی ضمانت دی تھی کہ ان کی مرضی کے بغیر ان کا سٹیٹس تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ بھارت کی موجودہ حکومت نے اس معاہدے کا پاس نہیں کیا اور کشمیر کی علاحدہ حیثیت کا خاتمہ کر کے اسے مرکز کے زیرِ انتظام علاقہ قرار دے دیا ہے۔ جموں کشمیر کے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے آئین کی دفعات ۳۷۰ اور ۳۵۱ ے موجود تھیں۔ مودی حکومت کا خیال ہے کہ یہ دفعات کشمیر کی ترقی میں رکاوٹ تھیں اس لیے ان کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ سیکڑوں سکیمیں اور پروگرام بغیر نفاذ کے موجود تھے، ریاست ترقی نہیں کر پا رہی تھی، مذکورہ آرٹیکلز کے خاتمے کے بعد بھارت میں ترقی کا ایک نیا دور شروع ہو گا۔ جب کہ دوسری جانب کشمیری اس مؤقف کو ماننے سے انکاری ہیں۔ ان فیصلوں کا علاقائی، تکنیکی یا آئینی پہلوؤں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق ہندو راشٹر سے جڑا ہوا ہے جس کا مقصد مسلمان اکثریت کو دوسرے درجے کا شہری بنا کر پیش کرنا ہے۔ بھارت کی اپوزیشن پارٹی کانگرس نے بھی اس سلسلے میں مبہم مؤقف اختیار کیا ہوا ہے۔ اس واقعے کے بعد کشمیر اب فوج کے توسط سے مرکز کے تحت رہے گا اور مستقبل میں اسے ملکی سیاست میں ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

ناول میں کشمیر کی صورتِ حال کو مختلف کرداروں کے توسط سے قاری پر آشکار کیا گیا ہے۔ ان میں بپلپ داس گپتا، تلوتما، موسیٰ یسوی، امریک سنگھ، اشفاق میر اور پنکی سوڈھی کے کردار نمایاں ہیں۔ ہر کردار کی کشمیر کے ساتھ جڑت کی کہانی ہے جو دھیرے دھیرے ہر شخص اور ہر شے میں ڈھل کر نمایاں ہوئی ہے۔ ان کرداروں کے علاوہ کئی ذیلی کہانیاں بھی موجود ہیں جو کشمیر کے بھارتی فوج پر روا رکھے جانے والے جبر، مجاہدین کی ذاتی چپقلشوں، مناقشوں اور منافقتوں کے ساتھ ساتھ صحافیوں کے کردار میں موجود کج رویوں اور بے اعتدالیوں کو آشکار کرتی ہیں۔ ان میں غفور کی کہانی، اعجاز کی کہانی، گل ریز کی کہانی، ایس مروگیسن کی کہانی، عثمان عبداللہ کی کہانی اور جالب قادری کی کہانی کشمیر کی ہولناک صورتِ حال کو اجاگر کرنے کے لیے مرکزی پلاٹ سے فنکارانہ طور پر جوڑی گئی ہیں۔ واقعات کا سلسلہ تلوتما کی ڈائری کے ذریعے آگے بڑھایا گیا ہے جس کی تلاشی اس باب کا راوی بپلپ داس گپتا مالک مکان اور تلوتما کے دوست کی حیثیت سے لے رہا

ہے۔ فلیش بیک تکنیک کے استعمال سے ماضی میں رونما ہونے والے واقعات قاری پر ایک ایک کر کے آشکار ہوتے چلے جا رہے ہیں اور خاص طرز کی فضا تشکیل پا رہی ہے جس میں خوف، ہمدردی اور دہشت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اس المناک اور غم و اندوہ کی صورتِ حال میں کشمیر کی خوب صورتیاں، پُرفضا مقامات اور کشمیریوں کے تمدن کی جھلکیاں بھی ناول کا حصہ بنی ہیں۔ مثلاً کشمیر کی خوب صورتی اور جنت شمائل وادی کو ناول میں اس طرح پیش کیا گیا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''موسم خزاں کا تھا۔ دل کی دھڑکنیں روک دینے والا جنگل اتنا ہی خوب صورت تھا جتنا صرف ہمالیہ کے جنگل ہی ہو سکتے ہیں۔ چنار کے درختوں نے رنگ بدلنا شروع کر دیا تھا۔ چراگاہیں تانبے جیسی سنہری رنگ ہو رہی تھیں۔ اگر قسمت اچھی ہو تو کوئی کالا بھالو یا تیندوا یا ڈاچی گام کا مشہور ہرن، ہنگول بھی نظر آ جاتا۔۔۔ میں ایک حد تک پرندوں کا ماہر بن چکا تھا اور یہ شوق اب بھی برقرار ہے، اور الگ الگ شناخت کر کے بتا سکتا تھا کہ ہمالیائی گریفن کون سی ہے اور داڑھیل گدھ کون سا۔ میں ڈھاری دار لافنگ تھرش، اور رنج بل فنچ، ٹائٹلر س لیف وابلر اور کشمیری فلائی کیچر کو پہچان لیتا تھا، جو تب تک قریب الختم ہو چکے تھے اور اب تک تو یقیناً ناپید ہو چکے ہوں گے۔'' **(۱۲)**

اس جنت نظیر وادی میں جہاں خوب صورتیاں اور رعنائیاں اطراف میں بکھری پڑی ہیں، اب یہ خوف، دہشت اور خون سے لبریز ہے۔ سیاح رخصت ہو گئے ہیں اور صحافی چلے آئے ہیں،، ہنی مون منانے والوں کی جگہ فوجیوں اور مجاہدین کی گولہ باری اور تشدد نے لے لی ہے۔ ماؤں کے لعل، بہنوں کے بھائی اور بیویوں کے شوہر، بیٹیوں کے باپ آزادی کے نعرے لگاتے لگاتے مزارِ شہدا کی خاک تلے آئے روز دفن ہوتے رہتے ہیں۔ قید خانے بھر گئے ہیں، ملازمتیں اور روزگار عنقا ہو گئے ہیں۔ قالین بنانے والے، دربان، زیور بیچنے والے، گل فروش، کشتی بان اور غلہ بان خالی پیٹ ہو چکے ہیں۔ موت چہار سو پھیلی ہے۔ وادی میں چراگاہوں، چشموں، کھیتوں، جنگلوں اور سبزہ زاروں کی جگہ قبرستان اُگ آئے ہیں۔ ہر گاؤں اور ہر بستی کا اپنا الگ قبرستان ہے۔ لائن آف کنڑول پر لاشیں جس تسلسل اور تواتر سے برآمد ہوتی ہیں، اس نے پُر بہار کشمیر کو خزاں زدہ کر دیا ہے۔

ناول کے اس حصے میں تلوتما کا کردار مرکزی اہمیت اختیار کر جاتا ہے جس میں اردون دھتی رائے کی

ذاتی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔اس کا حلیہ جس طرح سے بیان کیا گیا ہے وہ مصنفہ کی زندگی سے مماثلت رکھتا ہے۔ سانولی، دبلی اور گھنگریالے بالوں والی تلوتما جس کی ذاتی اور خاندانی زندگی تباہ حال ہے۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے ذاتی صلاحیتوں پر اعتماد کرتی ہے، آزاد خیال اور سماجی جکڑ بندیوں سے آزاد ہے۔ وہ سبز دیومالائی آنکھوں والے ایک کشمیری نوجوان مصور موسیٰ یسوی کی محبت میں گرفتار ہو کر کشمیر پہنچ جاتی ہے، جہاں اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی مدد سے کشمیر کی سیاسی اور عسکری صورتِ حال سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ موسیٰ یسوی جہادی تنظیم کا حصہ ہے اور نام بدل بدل کر بھارتی افواج کے خلاف کارروائیاں کرتا ہے۔اسی دوران میں موسیٰ کا ساتھی گل ریز مارا جاتا ہے اور وہ بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار کر لی جاتی ہے۔اس موقع پر ناول نگار نے بھارتی افواج کے کشمیریوں پر جبر و تشدد اور فوج کی منافقانہ رویوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ بھارتی فوجی کشمیر میں لکڑی کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ مقامی کاری گروں کو کام پر لگا کر قیمتی فرنیچر تیار کرواتے ہیں جو یا تو ان کے ذاتی استعمال میں آتا ہے یا اسے فروخت کر کے روپیا کمایا جاتا ہے۔ بارڈر پر مجاہدین سے پیسے بٹور کر انھیں سرحد پار کرنے دی جاتی ہے، فوجی گنوں کی گولیاں مجاہدین کو مہنگے داموں فروخت کر دی جاتی ہیں۔ اس طرح کے کئی مزید مالی فائدے ہیں جن سے فوجی مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے وہ نہیں چاہتے کہ عسکریت پسندی کا خاتمہ ہو اور وہ کشمیر کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ وہ تو کشمیریوں کی لاشوں پر بھی پیسا بنا رہے ہیں۔ اس لیے بہت سے بم دھماکے اور قتلِ عام وہ خود کرتے ہیں، بے گناہوں کو گھروں سے اٹھا لیا جاتا ہے، وادی کے خوفناک ترین تفتیشی مراکز میں منتقل کیا جاتا ہے، ان پر تشدد کیا جاتا ہے، بے گناہ اور مجبور کشمیریوں پر کھمبوں کو رولر کی طرح چلایا جاتا ہے جس سے ان کے عضلات کچلے جاتے ہیں، پانی میں غوطے دے دے جاتے ہیں، پلاس سے ناخن کھینچے جاتے ہیں، مردوں کے آلاتِ تناسل کو بجلی کے جھٹکے لگائے جاتے ہیں، پسی ہوئی مرچوں کو قیدیوں کی مقعد میں ٹھونسا جاتا ہے یا پانی میں ملا کر ان کے حلق میں اتار دیا جاتا ہے۔ مجاہدین کے بھیس میں کشمیریوں کے گھر گھس کر عزتوں کو پامال کرنا، بدنام چیک پوسٹوں پر شہریوں کو اذیت دینا تو معمول کی بات ہے:

> ''ہم انٹیلی جنس کی فراہم کردہ چند پریشان کن خبروں کی تفتیش کر رہے تھے جن کے مطابق بارڈر سیکیورٹی کی چند پوسٹوں پر ہمارے سپاہی، محفوظ راستہ قیمتاً فراہم کر رہے تھے۔ وہ ہوشیاری سے نظریں پھیر لیتے، جب کہ گوجر چرواہے، جو ان پہاڑوں سے اپنی

ہتھیلی کی لکیروں کے مانند واقف تھے، آنے والے جتھوں کی راہنمائی کرتے تھے۔ محفوظ راستہ بھی دراصل بازار کی بہت سی چیزوں میں سے ایک تھا۔اس سامان میں ڈیزل، شراب، کارتوس، دستی بم، فوجی راشن۔۔۔فوجی ٹرکوں کے قافلے جو ہر روز جموں سے کشمیر تک رسد لاتے تھے، واپسی پر اخروٹ کی لکڑی کے منقش فرنیچر سے لدے ہوئے ہوتے تھے۔''(۱۳)

فوج نے مجاہدین کے حوصلے پست کرنے اور عوامی مزاحمت کو دبانے کے لیے وادئ کشمیر میں ''ریومرزونگ'' بھی قایم کر رکھے ہیں جہاں نت نئی افواہیں گھڑی اور پھیلائی جاتی ہیں۔ افواہیں گھڑنا غاصب طاقتوں کا وہ اوچھا ہتھکنڈا ہوتا ہے جو مخالفین کو بدنام کرنے، عوام کو شکوک و شبہات میں ڈالنے اور اپنی ہی نظروں میں بے اعتبار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اس مقصد کے لیے حکومتیں آرٹ، موسیقی، تھیٹر، فلموں، کتابوں، ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات، سوشل میڈیا اور تعلیمی مواد کا استعمال کرتی ہیں اور خاص طرز کا ڈسکورس تشکیل دیتی ہیں۔ یہ ڈسکورس ایک مخصوص ولولہ پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں لاکھوں انسان دوسرے بے گناہ لاکھوں انسانوں پر چڑھ دوڑتے ہیں اور بغیر کسی احساسِ جرم کے خون بہادیتے ہیں۔ تاریخ دان اسے کسی جرنیل یا سربراہِ حکومت کے کھاتے میں ڈال کر ان تمام انسانوں کو مجرمانہ ذہنیت سے بری الذمہ قرار دے دیتے ہیں۔ جرنیلوں اور سپہ سالاروں کو ہیرو بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بھارتی حکومت اور افواج بھی جنگی ہسٹیریا پیدا کرنے کے لیے کشمیر میں اس طرح کی قبیح حرکات میں ملوث ہے۔

''بے پناہ شادمانی کی مملکت''میں نہ صرف مصنفہ نے بھارتی افواج کی کمزوریوں اور بے اعتدالیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے بلکہ کشمیر میں سرگرم جہادی تنظیموں پر بھی بے رحم تنقید کی ہے۔اس کا خیال ہے کہ کشمیر میں داخلی خبط اور جہاد کا تصور پاکستان اور افغانستان سے آیا ہے۔ کئی دہائیاں گزر گئیں اب تک اسلام کے آٹھ یا نو دعویدار کشمیر میں جہاد کر رہے ہیں جو کسی ایک نکتے پر خود کو مرکوز نہیں کر پائے۔ناول نگار نے مسلح جہادی تنظیموں کو تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا ہے جن میں سخت گیر، نرم گیر اور سیکولر جہادی شامل ہیں۔ ان جہادی گروہوں کے آپسی تعلقات کشیدہ ہیں اور نظریاتی طور پر وہ ایک دوسرے سے فاصلے پر موجود ہیں۔ ان اختلافات کا بھارتی فوج پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہے اور یہ جہادی گروہوں کو ایک دوسرے سے لڑوانے میں کامیاب

رہتی ہے۔ مثلاً ناول میں عثمان عبداللہ، تحریکِ آزادی کا نمایاں نظریہ ساز ہے، اس کے باوجود مجاہدین کا سخت گیر گروہ اسے دھمکیاں دیتا رہتا ہے کیوں کہ وہ جس ہم آہنگی کی بات کرتا ہے، وہ انھیں قابلِ قبول نہیں ہے۔ سخت گیر گروہ مقامی آستانوں، صوفیوں اور ولیوں سے عقیدت کو اچھا نہیں سمجھتا اور مستقبل کے تمام اختلافات کو گولیوں کے ذریعے حل کرنے کا حمایتی ہے۔ یہ گروہ لائن آف کنٹرول کی دوسری جانب سے پیسا اور ہدایات وصول کرتا ہے۔ اس کے ممبران بہتر تربیت اور اسلحہ کے حامل ہیں۔ ان کے مضبوط ایمان نے ان میں نظم و ضبط پیدا کر دیا ہے اور انھیں نظریاتی اور عملی طور پر دنیا کی بڑی فوجی طاقت سے متصادم ہونے کا حوصلہ دیا ہے۔ مجاہدین کا تیسرا گروہ جو خود کو ''سیکولر'' کہلاتا ہے، زیادہ تن آسان، طرحدار اور شان و شوکت والا ہے، اس کے ارکان شاعری کرتے ہیں، نرسوں اور رولر اسکیٹرس سے آنکھیں لڑاتے ہیں۔ کاندھوں پر رائفلیں سجا کر مٹر گشت کرتے ہیں۔ ان کے پاس ایسا کچھ نہیں جو جنگ جیتنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ارون دھتی رائے نے مجاہدین کی گروہ بندی کا تجزیہ ناول میں کچھ یوں کیا ہے:

> ''لوگ ان کم سخت گیروں سے محبت کرتے تھے، لیکن سخت گیروں سے خوف کھاتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی طاقت کو توڑنے کے لیے ان دونوں میں جھڑپیں ہوئیں جن میں سیکڑوں لوگوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ بالآخر کم سخت گیروں نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا، روپوشی سے باہر آنے اور گاندھی وادی طریقے سے اپنی جدو جہد جاری رکھنے کا عزم کیا۔ سخت گیروں نے اپنی لڑئیاں جاری رکھیں اور آنے والے برسوں میں ایک ایک کر کے شکار کر لیے گئے۔ جب ایک مارا جاتا تو اس کی جگہ لینے دوسرا آجاتا تھا۔''(۱۴)

کشمیر کی جنگ کے ساتھ ساتھ ان گروہوں کی شدت میں تندی پیدا ہوگئی ہے۔ لوگوں کی ہمدردیاں ان کے شاملِ حال ہیں۔ سخت گیروں سے لوگ خوف کھاتے، نرم گیروں کا احترام کرتے اور سیکولر مجاہدین پر شکوک کا اظہار کرتے ہیں، یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ کئی عثمان عبداللہ اس جنگ میں مارے گئے ہیں اور کئی آنے والے دنوں میں مارے جائیں گے۔ کندھوں تک لمبے بالوں اور گھنی سیاہ داڑھیوں والے مجاہدین شجاعت اور دلیری کی کہانیوں رقم کرتے، جنت میں گھر بناتے، کشمیر کی آزادی کی جنگ جاری رکھیں گے، کیوں کہ یہ

جنگ اب محض آزادی کی جنگ نہیں رہی، کشمیریوں کے وقار کی جنگ بن چکی ہے اور وقار کو بچائے رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہندوستان کے خلاف جوابی جنگ جاری رکھیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آزادی مل بھی جائے تو کشمیر پر کس کا حقیقی حق ہو گا؟ پاکستان کا؟ بھارت کا؟، چین کا؟ یا خود کشمیریوں کا؟

ناول میں ہم عصر تاریخ کو فکشنلائز کرتے ہوئے مصنفہ نے نکسل باڑی تحریک کو فراموش نہیں کیا۔ یہ تحریک ۱۹۷۶ء میں اس وقت منظرِ عام پر آئی جب مغربی بنگال کے کسان جاگیرداروں کے خلاف اپنے مالکانہ حقوق مانگ رہے تھے۔ یہ تحریک مغربی بنگال سے اڑیسہ، بہار اور اتر پردیش کے علاقوں میں پھیلتی گئی۔ اس تحریک سے منسلک نوجوان، چینی انقلاب کے بانی ماؤزے تنگ کے خیالات سے متاثر تھے اس لیے انھیں ماؤنواز بھی کہا جاتا ہے۔ وہ عوامی جمہوری انقلاب لانے کے بجائے پُر تشدد انقلاب کے حامی تھے، اسی لیے انھوں نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا مارکسسٹ سے علاحدگی اختیار کرتے ہوئے مسلح جدوجہد کا راستا اختیار کیا۔ مذکورہ تحریک کے بھارتی حکومت اور عوام پر گہرے اثرات ہیں کیوں کہ یہی وہ تحریک تھی جو کیرالہ اور بنگال میں زمینی اصلاحات کا باعث بنی۔ اسی تحریک نے اُتر پردیش اور بہار جیسی ریاستوں میں دلتوں اور غریب قبائل پر ہونے والے مظالم کے خلاف صدا بلند کی، جس کے نتیجے میں بھارتی حکومت نے مختلف اداروں کو جمہوری اصولوں سے ہم آہنگ کیا اور سیاسی نظام میں جواب دہی کا عمل مضبوط ہوا۔ نکسل باڑی کی یہ تحریک اب چھتیس گڑھ کے جنگلوں میں ریاستی پولیس سے برسرِ پیکار ہے۔ ان جنگلوں میں مقیم قبائلی صدیوں سے یہاں آباد ہیں اور اب حکومت انھیں بے دخل کر کے یہاں فیکٹریاں لگانا چاہتی ہے کیوں کہ یہاں بڑی تعداد میں زیرِ زمین معدنیات موجود ہیں جو حکومت اور سرمایہ دار کمپنیوں کے لیے مالی فائدے کا باعث بن سکتی ہے۔ مقامی قبائل ان زمینوں سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں اور سرمایہ دار کمپنیوں کے ایما پر حکومت انھیں بے دخل کرنا چاہتی ہے۔ بنیادی طور پر ماؤنوازوں اور مقامی ریاست کے مابین لڑائی زمین اور اس پر قبائلیوں کے حقوق کی ہے۔

ناول میں بستر کے جنگلوں میں آدی باسی قبائل کی جدوجہد کو کامریڈ ریوتی جو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (ماؤئسٹ) کی کل وقتی کارکن ہے، کے کردار کے ذریعے قاری پر آشکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ریوتی جنتر منتر پر ہونے والے احتجاج میں تین دن گزارنے کے بعد اپنی نومولود بیٹی کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے جو تلوتما، انجم اور صدام حسین اُٹھا کر جنت گیسٹ ہاؤس میں لاتے ہیں۔ تلوتما اُسے مس جبین دوم کا نام دیتی ہے جو

دراصل اس کے دوست موسیٰ یسوی کی بیٹی کا نام تھا اور وہ کشمیر میں بھارتی فوجیوں کی گولہ باری کی نذر ہو گئی تھی۔ کچھ عرصے بعد ڈاکٹر آزاد بھارتیہ کو ایک خط موصول ہوتا ہے جس میں ریوتی کی کہانی کی مدد سے اس بچی کے ماضی سے پردہ اٹھایا جاتا ہے۔ خط میں ریوتی کی جو کہانی بیان ہوئی ہے وہ مصائب سے بھرپور المیہ کہانی ہے۔ ریوتی مادرانہ جذبے سے سرشار ہے اور اپنی بیٹی کو اس زندگی سے دور رکھنا چاہتی ہے جو بھوک، مشکلات اور مصائب سے پُر ہے:

> ''ایک صبح ڈاکٹر آزاد بھارتیہ ایک خط لیے ہوئے جنت گیسٹ ہاؤس آئے جس کے مخاطب وہ خود تھے۔ یہ خط ایک عورت نے انھیں خود دیا تھا جس نے اپنا نام پتا نہیں بتایا تھا، صرف اتنا کہا تھا کہ یہ خط بستر کے جنگلوں سے آیا ہے۔ انجم کو قطعی معلوم نہ تھا کہ یہ جگہ کیا ہے یا کہاں ہے۔ ڈاکٹر آزاد نے اختصار کے ساتھ، وہاں رہنے والے آدی باسی قبیلوں، مائننگ کمپنیوں کے بارے میں بتایا جو ان کی زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتی تھیں اور ان ماؤوادی چھاپہ ماروں کے بارے میں بھی جو ان سیکیورٹی فوجوں کے خلاف لڑ رہے تھے جو کمپنیوں کے لیے زمینیں خالی کرانے پر تعینات تھیں۔'' (۱۵)

خط میں ریوتی کی کہانی کے ذریعے آدی باسی قبائل کے مسائل اور ان کی مشکلات سے پھرپور زندگی کو سامنے لایا گیا ہے۔ ایک عورت اس ماحول میں کیسے زندگی گزارتی ہے، کتنے مسائل کا سامنا کرتی ہے اور مقامی قبائلی روایات اس کے ساتھ کیا کرتی ہیں اس کا حال اس خط میں موجود ہیں۔ خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف ریوتی نہیں اس کی ماں نے بھی اسی انداز میں زندگی کے دن پورے کیے تھے، یہی وجہ ہے کہ اب ریوتی اپنی تیسری پیڑھی کو اس ماحول سے باہر نکالنا چاہتی ہے اور اُدیہ (نومولود بچی کا نام جو اس کی ماں نے تجویز کیا ہوا ہے) کو جنتر منتر پر لاوارث چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ خط کا اختتام تمام کرداروں پر المیاتی اثرات مرتسم کرتا ہے اور اس لاوارث بچی سے ان کی ہمدردیاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔

اردون دھتی رائے نے ''بے پناہ شادمانی کی مملکت'' میں بھارت کی ہم عصر تاریخ کو جس طرح ماہر فنکار کی طرح فکشنلائز کیا ہے، وہ نہ صرف قابلِ تحسین ہے بلکہ حیرت انگیز بھی۔ اس نے سماجی اور تاریخی حقیقتوں کو قاری پر آشکار کرنے کے لیے کسی تاریخ دان کا روپ اختیار نہیں کیا بلکہ تاریخ کو ناول کی بُنت یا ساخت

میں زمان و مکاں کے تحت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس نے ایک ماہر فنکار کے مانند بھارت کے عصری حقائق کو مسخ نہیں کیا بلکہ تخیل سے ممزوج کر کے ناول کو نئی جہت دی ہے۔دیکھا جائے تو جہاں ناول انسانی زندگی کا ترجمان ہوتا ہے وہیں تاریخ کا تعلق بھی انسانی زندگی سے جُڑا ہوتا ہے،اس مشترک خصوصیت کی بنیاد پر دونوں میں رشتہ قایم ہونا فطری ہے۔دنیا میں زیادہ تر کامیاب ناول عصری اور تاریخی شعور کے حامل رہے ہیں اور ان میں تاریخ اس طرح موجود ہے کہ نہ تاریخی وقوعہ مسخ ہوا ہے اور نہ ناول کی شعریات سے روگردانی ہوئی ہے۔اس سے قبل بھی انگریزی میں متعدد ایسے ناول نگار موجود ہیں جنھوں نے بھارتی تاریخ کو خاص تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان میں ای ایم فوسٹر ،ریڈیارڈ کپلنگ،بیپسی سدھوا اور امیتاو گھوش کے نام لیے جا سکتے ہیں۔فکشن کے موجودہ بین الاقوامی منظر نامے میں ناولوں میں قومی ہم عصر تاریخ کو پیش کرنا موجودہ فکشنی منظر نامے کا لازمی حصہ بنتا جا رہا ہے،اس حوالے سے ترکی کے معروف ناول نگار اورحان پاموک کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے جس نے اپنے ناولوں میں قومی ہم عصر تاریخ کے ساتھ ساتھ ترکی کی پرانی تاریخ کو بھی فکشنلائز کیا ہے۔اس حوالے سے اس کا ناول ''برف'' خاص طور پر نمایاں ہے۔ارون دھتی رائے نے بھی ہم عصر بھارتی تاریخ کو تخلیقی قوت، عمیق مشاہدے اور ارفع تخیل سے از سر نو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔مصنفہ کی اس کوشش کے نتیجے میں مذکورہ ناول میں ادب، عمرانیات اور تاریخ کی حدیں باہم پیوست ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ ارون دھتی رائے،بے پناہ شادمانی کی مملکت،مترجم:ارجمند آرا،(کراچی:آج پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء)،ص ۳۰۔

۲۔ عرش ملسیانی،نغمہ سرمدی،(دہلی:انجمنِ ترقی اُردو ہند،سن ندارد)،ص ۱۰۔

۳۔ ارون دھتی رائے،بے پناہ شادمانی کی مملکت،ص۲۱۔

۴۔ سید سلیم چشتی،رحمتہ الہند،(اجمیر:غریب نواز اکیڈمی،۱۹۸۸ء)،ص۳۸۔

۵۔ ارون دھتی رائے،بے پناہ شادمانی کی مملکت،ص۵۴۔

۶۔ ایضاً،ص۴۲۱۔

۷۔ ایضاً،ص۵۳۔

۸۔ ایضاً، ص۴۳۔
۹۔ ایضاً: ص۱۰۷۔
۱۰۔ ایضاً، ص۱۱۹۔
۱۱۔ ایضاً، ص۱۱۰۔
۱۲۔ ایضاً، ص۱۸۱۔
۱۳۔ ایضاً، ص۱۸۴۔
۱۴۔ ایضاً، ص۳۳۹۔
۱۵۔ ایضاً، ص۳۹۔